اپنے طور پر یہ معافی نامہ حاصل کر کے نہ تو اب کبھی مجھے احساسِ جرم ہوا نہ کسی پچھتاوے کا احساس..... میں نے رفتہ رفتہ اپنی کمزوریوں کے ساتھ جینا سیکھ لیا ہے۔ مشفق خواجہ ساری زندگی ہمارے کہنے پڑھنے سے متاثر نہ ہو سکے۔ اب جب وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو ان کے لیے بھی یہی احساس دل میں ہے کہ وہ بھی خواجہ جی کے بھائی تھے۔ انہیں بھی تو صرف محبت درکار ہوگی جو بوجوہ ہم دونوں ادا نہ کر سکے۔ یہ قرض بھی واجب الادا ہے۔

احمد علی

بھائی احمد علی اونچے لمبے پٹھان آدمی۔ ان سے بھی وائس آف امریکہ کے دوران ملاقاتیں ہوئیں۔ مجھ سے ملاتے رہے۔ جب ہم داستان سرائے میں آ گئے تو بھائی احمد علی نے سب سے پہلے تکہ کباب بنا کر ہم سب کو کھلائے۔ پٹیالے کے پٹھان اردو بولتے تھے اور ساری ترکیب بھی اردو میں سکھاتے تھے۔

کبابوں کی انگیٹھی، قیمہ، مسالہ، کبابوں میں پڑنے والی بالائی، نان اپنے ساتھ لاتے۔ کھانے والوں میں ریاض محمود، خاں صاحب اور جو بھی مہمان حاضر ہوتے سب چسکے لے لے کر کھاتے رہتے۔

پورے کبابیے، کبھی بجلی کا پنکھا ٹھیک کرتے، کبھی سلاخیں الٹاتے پلٹاتے، کبھی ویسے ہی شور مچاتے۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد ان کی کباب پارٹیاں اور گہما گہمی ختم ہو گئی۔ اب وہ مجھے ملنے ضرور آتے ہیں لیکن اس ملاقات میں تو اثر نہ رہا۔ پھر انہوں نے لاہور کالج کے سامنے APWA کا سامان رکھ کر Sale Point بنا لیا اور ساخت کردہ چیزیں بیچنے لگے۔

مشقت بڑھ گئی۔ کام برکت کا بھی باعث ہوتا ہے لیکن جب یہ تعلقات کا وقت بھی ہڑپ کرنے لگے تو منفی اثرات واضح ہو جاتے ہیں۔ ہر Workaholic کو اس مقام پر ٹھہر کر سوچنا چاہیے کہ انسان کے کردار کی خوبی توازن ہے۔ جو کام بھی توازن سے نکل کر شدت اختیار کرتا ہے، اس سے چاہے وہ نیکی ہی کیوں نہ ہو، نقصان زیادہ ہے۔

ذوالفقار احمد تابش

خاں صاحب کا تعلق تابش سے اردو سائنس بورڈ سے شروع ہوا۔ تابش اردو بورڈ میں حنیف رامے اور محمد چغتائی کے ساتھ ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے۔ گھنگھریالے بال، درمیانہ قد، ناک پر عینک اور چہرے پر ملائمت رہتی تھی۔ تابش عجیب طور روحانیت اور عقیدت میں توازن رکھنے کے قائل تھا۔ اسی لیے اس کی کبھی خاں صاحب سے نہ ہوئی۔ اپنے خیالات میں پختہ ہونے کے باوجود کبھی مناظرے کی نوبت نہ آئی۔

جب خاں صاحب ریٹائر ہوئے اور ہم 121۔سی میں آ گئے تو تابش ان سے ملنے آتے رہتے تھے۔ یہ عقیدت ت کے رشتے تھے۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ کبھی تابش کو جاننے کا مجھے بھی موقع ملے گا۔

لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد تابش اچانک پرسنل زندگی سمیت میرے قریب ہو گیا۔ وہ اور مریم ے پاس آ جاتے، باتیں کرتے، اپنی زندگی کے بکھیڑے بیان کرتے۔ زندگی میں جو تبدیلی اچانک آ گئی تھی اس سے نہا ہونے کے متعلق اپنی تشویش ظاہر کرتے۔ بچے چھوٹے تھے۔ ریٹائر ہونے پر پیسوں کی قلت تھی۔ کام کہیں ملتا نہ ش بہت ملول اور پریشان رہتا تھا۔

اب کچھ عرصہ ہوا تابش میرے پاس کم ہی آتے ہیں۔ مجھ سے نہ ان کو محبت ملتی ہے نہ اعانت۔ جو چشمہ خشک ہو س پر ہولے ہولے لوگ پانی بھرنے نہیں آتے۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد میرے ماتھے پر تیوری، زبان میں رویے میں روکھا پن آ گیا ہے۔ لوگ مجھ سے خوفزدہ ہو کر بچھڑتے جا رہے ہیں۔

یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے۔ جو آدمی کبڑا ہو، وزن اٹھا کر کانپتا ہو، اس پر وزن کیا لادنا؟

اصغر ندیم سید

ملتان ایک زرخیز خطہ ہے۔ ہر اعتبار سے یہاں روئیدگی کی ریت زیادہ ہے اور اس نے پاکستان کو زرعی طور پر ین لوگوں کے اعتبار سے بڑا اعتباری بنایا ہے لیکن لاہور شہر میں ایک بڑے شہر کا تکبر اپنے سوائے کسی کو ماننے پر مشکل ہے رضامند ہوتا ہے۔

ایک شخص جو ملتان سے آتا تھا اور خاموشی سے خاں صاحب کے درشن کر کے چلا جاتا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ ی رکھا۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا۔

''خاں صاحب! یہ اونچا لمبا، مسکراتے چہرے والا کون ہے جو اتنے حلم اور انکساری سے ملنے آتا ہے؟''

''ہے ایک۔''

''پھر بھی؟''

''ہے ایک اصغر ندیم سید۔''

ہولے ہولے مجھے پتہ چلا کہ اصغر ندیم سید نے ملتان میں بیٹھ کر ٹیلی ویژن کے لیے کچھ ڈرامے لکھ رکھے تھے چاہتا تھا کہ کسی طرح ٹیلی ویژن سٹیشن کا دروازہ اس پر کھل جائے اور وہ میڈیا میں اپنا مقام خود بنائے۔ خاں صاحب ے اپنے ساتھ لے گئے۔

اور یوں ٹیلی ویژن سٹیشن کو ایک بہت بڑا ڈرامہ نگار مل گیا جو راستہ دکھانے والوں سے بھی ہنر مندی میں آگے

اجمل نیازی

اجمل نیازی ایک معروف شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ قومی لباس قمیض اور جیکٹ پہنتے ہیں۔ ان کے سر پر ایک خاص قسم کا پٹکہ یا چادر قبائلی علاقوں کی یاد دلاتی ہے۔ شاید اس طرح کوئی چادر سر پر باندھے تو مضحکہ خیز لگے لیکن اجمل کی خوبصورتی سے اس میں بھی ایک طرحداری پیدا ہو جاتی ہے۔

اجمل نیازی میں منیر نیازی کی طرح اپنے نیازی ہونے پر بہت فخر ہے۔ وہ ہر چیز بھول سکتے ہیں۔ یہ نہیں بھولتے کہ وہ نیازی ہیں اور ان کی اصل شناخت اس کے منبع کی طرف اشارہ کرتی ہے، جہاں سے دریا چھوٹا تھا۔ شاید کسی نے اجمل نیازی کو پینٹ قمیض پہنے دیکھا ہو۔ وہ بڑی سے بڑی محفل میں اونچے سے اونچے مقام پر، امریکی، یورپی، انگریز مندوبین کے درمیان بھی اپنی قومی اور قبیلے کی شناخت قائم رکھتے ہیں۔ یہ کوا کبھی ہنس کی چال نہیں چلتا اور شاید اسی لیے اپنی نظر میں اور دوسروں کے ہاتھوں عزتِ نفس پر حملہ نہیں ہونے دیتا۔

بڑے سال اُدھر کی بات ہے کہ ایک روز اجمل ہمارے گھر آئے۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ اس کی گھر والی ساتھ تھیں۔ ماحول گھریلو تھا جس میں ادب، سیاست اور اقدار کی باتیں سرے سے غائب تھیں۔ غیر رسمی ملاقات کے بعد یہ تینوں رخصت ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد اجمل نیازی اکیلا آیا۔ وہ کچھ پریشان تھا، لیکن شرمیلے پن کے باعث اصلی پریشانی کی طرف نہیں آ رہا تھا۔

"کیا بات ہے اجمل۔ تم آج خلافِ توقع گول مول باتیں کر رہے ہو؟ نہ ٹھیک سے سنتے ہو نہ صحیح جواب دیتے ہو۔"

"اچھا ہے بانو آپا۔ آپ نے پوچھ لیا ورنہ شاید میں بتائے بغیر ہی چلا جاتا۔"

ایسا موقع ہاتھ آئے تو میں ون اپ ہو کر شیر ہو جاتی ہوں۔

"ہاں ہاں بتاؤ بلا تکلف بتاؤ۔ کیا بات ہے؟"

"میرے ساتھ تقدیس آئی تھی ناں۔"

شرمائی لجائی سفیدی گھڑی۔

"اچھا اچھا تمہاری بیٹی۔"

"جی جی..... اسے ہارٹ پرابلم ہے۔ مجھے اس کا آپریشن کرانا ہے۔" اجمل بولا۔

میں حیران رہ گئی۔ میں سمجھتی تھی ہارٹ پرابلم بوڑھوں کی جاگیر ہے اور ایسے پھول سے بچوں کو تو بس زکام، کھانسی، ملیریا بخار ہی ہوا کرتا ہے۔

"گھبراؤ نہیں، ٹھیک ہو جائے گی۔"

اب مزید گھبرا کر اجمل بولے "وہ جی میں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر جواد اس کا آپریشن کرتے۔ میں P.I.C. میں گیا

یں وہ مل نہیں سکے۔ مصروف ڈاکٹر ہیں۔ ان تک رسائی مشکل ہے۔"

"بھائی! خاں صاحب کا بھانجا ہے جواد۔ میں اسے فوراً کہہ دوں گی۔ تقدیس چنگی بھلی ہٹی کٹی ہو جائے گی۔ تم ...کرو بس اللہ پر بھروسہ کرو۔"

اپنے آپ کو اوپر اٹھانے اور بڑا سمجھنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ میں نے جواد سے بات کی۔ معاملہ طے پا گیا۔ تقدیس واقعی ہٹی کٹی ہو کر گھر چلی گئی اور اجمل ہمارے اور قریب آ گیا۔ اس مدد کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اجمل نیازی پہلے تو شاید ...اس لیے عزت کرتا تھا کہ میں خاں صاحب کی بیوہ تھی لیکن اب مجھے اس کی عقیدت حاصل ہو گئی۔

ایک فون

ایک سفارش

اور اتنا بڑا صلہ

یہ زندگی کچھ کم حیرت انگیز تو نہیں۔

☆☆☆

ایک گھر کے دو راستے

اجمل نیازی

یہ کم کم ہوا ہے کہ میاں بیوی دونوں کسی میدان میں نامور ہوئے ہوں اور انہوں نے اپنا اپنا مقام بنایا ہو۔ ایک ...ے کے لیے مثال بن گئے ہوں۔ ایک دوسرے کی مثال بن گئے ہوں بلکہ شال اور ڈھال بن گئے ہوں۔ شال بانو قدسیہ کے سر پر اور ڈھال اشفاق احمد کے ہاتھ میں۔ یہ تو ہوا کہ خاوند یا بیوی کی وجہ سے دوسرے کو ملازمت مل گئی اور ترقی کے ...تحفے بن گئے۔ یہ بھی ہوا کہ دو لکھنے والوں نے شادی کر لی مگر آگے چل کر راستے بدل گئے۔ کوئی ایک بہت پیچھے رہ گیا یا ...آگے نکل گیا۔ بیویوں میں تو اکثر لکھنا چھوڑ گئیں۔ کچھ نے اپنے شوہروں کو چھوڑ دیا۔ چند ایک نے بے چاروں کو کہیں کا نہ چھوڑا۔ بہت کم ایسے جوڑے تھے جو ایک دوسرے سے جڑے رہے۔ ایک دوسرے کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے بھی ہیں۔

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ ایک سدا بہار مثالی جوڑا ہے۔ سنا ہے یہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ بھارت میں ...آئیڈیل بیوی سے مل کر میں نے کہا تمہارے لیے جٹی کا لفظ کس قدر شاندار ہے۔ "رب نے کرایا ساڈا اپناں تے میل ..." چین زمین پر ہوتے ہیں۔ اب تو بہت کم رہ گئے ہیں۔ ہر کہیں واٹر ورکس اسکیمیں پہنچ گئی ہیں۔ جب بہت سوچنے ...کی اسکیمیں شروع ہوتی ہیں تو محسوس کرنے والوں کی اقلیمیں برباد ہو جاتی ہیں۔ ترقی یافتگی میں وارفتگی اندر رہتی ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا نظریۂ فن اسی لہر کے گرد گھومتا ہے۔

مغرب میں ازدواجی زندگی کا جو حشر ہوا، وہ ہم اپنے ہاں برپا کر لینے کے لیے بے چین ہوئے جا رہے ہیں۔ میاں بیوی اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ گھروں میں طبلہ بجتا ہے یا طبل بجتا ہے۔ مغربی موسیقی کی کیفیت ہنگامے ...بدبختی جاری ہے۔ اب ان گھروں میں مار پیٹ کے واقعات عام ہو رہے ہیں۔ مغرب میں شوہر اپنی بیویوں کو اکثر

زدوکوب کرتے ہیں۔ مشرق میں کبھی پہلے یہ وارداتیں عام تھیں۔ جو کام چھوڑ دیتے ہیں وہ شروع کر دیتے ہیں۔ جو کام [illegible] کے ہاں رک جاتے ہیں ہم انہیں نئے سرے سے اپنا لیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی پیروی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔

میں آزادی نسواں کی مکمل حمایت کرتا ہوں مگر اس سے پہلے آزادی انسان کا مطالبہ کرتا ہوں۔

یہ سب باتیں مجھے الجھا رہی ہیں اور میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے لیے ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ ان [illegible] پر علیحدہ علیحدہ تحریریں بھی لکھی گئی ہیں مگر یہاں یہ احساس میرے لیے بڑی انوکھی مسرت کا باعث ہے کہ دو آدمیوں [illegible] ایک مضمون بھی لکھا جا سکتا ہے۔ عورت اور مرد مل کر جو اکائی بنتی ہے، اسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ مقابلے کے جنون [illegible] ہم سے یہ لطف بھی چھین لیا ہے۔ جب عورت اور مرد اپنے اپنے مقام کو جان لیتے ہیں تو صاحب مقام بن جاتے [illegible] قدیم چینی فلسفہ تاؤمت (تاؤازم) کے حوالے سے ایک دائرہ دو قوسوں سے بنتا ہے۔ ایک فاعلی اور دوسری انفعالی [illegible] ہے۔ دونوں کی وحدت اور یکتائی سے دائرہ وجود میں آتا ہے۔ دائرہ چھوٹا بڑا ہوتا رہتا ہے۔ قوسیں وہی رہتی ہیں۔ [illegible] قوس میں ایک نقطہ فاعلی قوس کا کہیں ہوتا ہے۔ یہی حالت دوسری طرف ہوتی ہے۔ ایک بڑا دائرہ بانو قدسیہ اور اشفاق [illegible] نے بنایا ہے۔ اشفاق احمد میں بانو قدسیہ، بانو قدسیہ میں اشفاق احمد رہتا ہے۔ ممتاز مفتی نے ''اوکھے لوگ'' میں دونوں [illegible] الگ الگ خاکہ لکھا ہے۔ شاید ایک خاکہ دو بار لکھ دیا ہے۔ بانو کے خاکے میں اشفاق، اشفاق کے خاکے میں بانو [illegible] زیادہ ہے۔ بڑی تحریر ہے۔ یہ اوکھے لوگ بڑے سوکھے لوگ ہیں۔ وہ دونوں مختلف ہستیاں ہیں مگر ایک زندگی انہوں [illegible] بسر کی ہے۔ ایک دوسرے کی زندگی بسر کی ہے۔ اس زندگی کا عنوان اشفاق احمد ہے اور خلاصہ بانو قدسیہ ہے۔ [illegible] مزاجاً کاہل آدمی ہیں۔ جی رہے ہیں جیسے لیٹے ہوئے دھوپ سینک رہے ہیں۔ انہیں تب خبر ہوتی ہے کہ دھوپ [illegible] تھی جب بانو سورج اور ان کے درمیان آ کھڑی ہوتی ہے۔ بانو کی چھتری بھی ان کے لیے سیک کو مزیدار بنا دیتی [illegible] ایک اچھی ازدواجی زندگی کا منظر ہے۔ اسے بانو نے منظر نامہ بنا دیا ہے۔

ادب میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا مرتبہ اُنیس بیس کا ہے۔ بانو کہتی ہیں کہ بیس اشفاق احمد ہیں۔ [illegible] کرانتیس بنتے ہیں۔ دونوں نے فن و ادب کا کوئی میڈیا چھوڑا نہیں۔ ڈرامہ، افسانہ، ناول، سکرپٹ، سفرنامہ [illegible] بہت کام۔ اب وہ الگ سے بھی کوئی کام کرتے ہیں تو لگتا نہیں۔ وہ اپنی یگانگتوں کو ظاہر ہونے سے بچاتے رہتے ہیں [illegible] دونوں کو پانا مشکل ہے۔ الگ الگ کر کے بھی سمجھنا مشکل ہے۔ وہ دونوں مس انڈرسٹڈ مخلوق ہیں۔ ان پر نگاہِ غلط [illegible] ڈال کر دیکھ لیجیے۔ سارے اندازے غلط ہو جائیں گے۔ ان سے بہتر اور کمتر آدمی ہوں گے مگر ان کے جیسا اور کوئی [illegible]
ان دونوں کے اندر ایک ایک شاعر بھی ہے۔ ابھی انہوں نے نجانے کیا کیا چھپایا ہوا ہے۔ جو کچھ مل کر چھپا رکھا ہے [illegible] نے، کسی کو نہیں مل سکتا۔

بانو پُراسرار لگتی ہیں۔ اشفاق صاحب اسرار لگتے ہیں۔ دونوں صوفی ہیں۔ ملامتی صوفی۔ دونوں کا [illegible] ہے۔ ردِعمل ایک سا۔ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ ردِعمل چھپایا جا سکتا ہے۔ ایک بے نام سانجھ ان کے درمیان قائم ہے۔ [illegible] دوسرے کو مانتے ہیں، جانتے نہیں۔ جاننا ضروری نہیں۔ یہی ایمان بالغیب ہے۔ ظاہر مختلف باطن مشترک۔ ایک [illegible] ان کے پاس جس میں سے بیک وقت اپنی پسند کی غذا نکال لیتے ہیں۔

دونوں اپنے وقت کے مصلوب کردار ہیں۔ بانو اشفاق کی صلیب پر لٹک گئی ہے۔ انہیں تو یہ صلیب دکھائی بھی دی۔ ''راجہ گدھ'' کو چھوڑ کر تقریباً تمام تخلیقات میں بانو کا انداز ''تیرے سامنے بیٹھ کے رونا تے دکھ تینوں نہیں دسنا'' ہے۔ وہ روتی ہے اور سامنے بھی نہیں بیٹھتی۔ ایسے میں اپنے آپ سے بھی دور کہیں ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی مشکلوں کا ں چلنے دیا اشفاق احمد کو۔ اپنے آپ کو محدود کر کے لامحدود ہونے کی کوشش کی ہے مگر لگتا ہے کہ یہ حدود اس دائرے سے جاتیں جو اشفاق احمد کے گرد بن گیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ایک گھریلو عورت عظیم ادیبہ بن گئی ہے۔ بانو کو بڑی عزت ہے۔ انہوں نے سرکی چادر کو کاغذ بنایا اور چاردیواری میں شش جہات تلاش کر لیا ہے۔ وہ سامنے سے بہت مست ہیں مگر اندر بہت ایکٹو ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ظہور اور اخفا میں فرق مٹ جائے۔ اشفاق احمد نے نئے علام کو اپنے اندر گم یا ہے۔ اس گمشدگی کو بینیڈ وا وران پڑھ بابوکی کٹیاؤں میں ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ دانش جب تکمیل اور تازگی کی طرف تی ہے تو لوک دانش میں جمع ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ لاعلمی کی بھی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے تو نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی؟

میں نے کہا ''معلوم نہیں۔''

وہ اور خوش ہوئے۔

اصل بات معلوم سے نامعلوم، نامعلوم سے معلوم کی طرف سفر کے دوران ملتی ہے۔ ہونی ہو کے رہتی ہے اور یہ نی میں موجود ہوتی ہے۔ اشفاق احمد لوگوں کو حیران کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے اس ہنر سے ے پریشان ہیں۔

ایک بات میں اشفاق احمد کو بانو پر برتری حاصل ہے۔ بانو ان کی ہر طرح کی برتری کو دل سے مانتی ہے۔ حمد کو اس صورتحال نے خاصا سازگار کیا ہے۔ اشفاق احمد گفتگو کے بادشاہ ہیں۔ موقع کے مطابق ان جیسی بات ملکہ کم کم کسی کو ملا ہوگا۔ اس ضمن میں بھی ان کی ''ملکہ'' کو نظرانداز کرنا مشکل ہے۔ بانو ان کے سامنے بولتی نہیں۔ بولتی یسے جیسے تھکے ہارے گھر آئے ہوئے کے لیے درواز کھولتی ہیں۔ پھر ان کی خدمت کی فراوانیاں سارے ماحول میں شبو گھولتی ہیں۔

اشفاق احمد تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اپنے زمانے میں کھڑے اشفاق احمد جو باتیں کر رہے ہیں، کوئی نہیں کر ں سکتا یا کرنا چاہتا نہیں۔ وہ ان چیزوں کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور اس وقت کرتے ہیں جب ان کی حمایت ہوتا ہے۔ سائنسی ترقی کے خلاف، ترقی کے خلاف، علم کے خلاف، کتاب کے خلاف، سب سے پہلے یہاں نے کیسٹ کے ذریعے مطالعے کی بات چھیڑی۔ اس وقت سب سے زیادہ ان کی مخالفت انتظار حسین نے کی۔ ں طرح کی پہلی کیسٹ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے زیراہتمام سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے تیار کی گئی۔ کتاب ور اس کا اردو ترجمہ انتظار حسین نے کیا۔

یہ اتفاق ہے۔ ایسے اتفاقات اشفاق احمد کی زندگی میں بہت ہیں۔ ان کی فراست کی فطرت نے کئی بار حمایت نو جی نے ہمیشہ اشفاق احمد سے اتفاق ہی کیا ہے۔ اس لیے گھر سے باہر اشفاق احمد بہت اختلافی گفتگو سن کر بھی

طیش میں نہیں آتے۔ جب راولپنڈی میں ایک تقریب کے دوران نوجوانوں نے اپنے جملوں کو جملوں کے برابر [illegible] اشفاق احمد نے سٹیج پر آ کر سیدھے سیدھے اعتراف سے بات شروع کی اور وہ ساری باتیں جو نوجوانوں کے اعتر[illegible] سے بھری ہوئی تھیں، خود انہی کے کندھوں پر رکھ دیں اور وہ خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے یہ گٹھڑیاں اٹھا کر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ ایسے واقعے اشفاق احمد کی زندگی میں کافی ہیں۔ ریڈیو پاکستان پر جب تلقین شاہ کا پیکر پیش [illegible] کرتے ہیں تو بھی ہمیں برے نہیں لگتے۔ یہی باتیں کوئی اور کرے تو ہم اس سے لڑ پڑیں۔ ہر شخص کے اندر ایک [illegible] ہوتا ہے۔ ہم اسے چھپاتے رہتے ہیں۔ سامنے آنے پر منافق کے دشمن بن جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

اشفاق احمد نے بندے کے اندر سے نکال کر اس بندے کو سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ ہم زاد بھی ہوتا ہے [illegible] تسخیر نہیں ہوتا ہر کسی کا۔ اشفاق احمد نے اپنا ہم زاد تسخیر کر لیا ہے۔ ہم تو اپنے ہم زاد کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ [illegible] ہوتے رہتے ہیں اس سے۔ اشفاق احمد کی مدد سے ہم بلیک میل ہونے سے تو بچ سکتے ہیں۔

یہ نہیں کہ اشفاق احمد کو غصہ نہیں آتا۔ اگر کسی آدمی کے ہر عمل کا جواب محبت بھرے ردعمل سے رنگا جائے تو [illegible] انگیز حد تک سوہنی سرشت لہو میں جاگ اٹھتی ہے ورنہ اشفاق احمد بھی خان ہیں۔ پٹھان کا رویہ گھروں میں بھی حا[illegible] ہے اور بلا شرکت غیرے ہوتا ہے۔ حاکم کو حلیم کرنے والی بڑی ہستی عورت ہے۔ مقابلہ تو حاکم کو ظالم بناتا ہے۔ مغر[illegible] یہی کچھ ہو رہا ہے۔ وہاں عورت مرد کے برابر آ کر بھی مظلوم بنی پھرتی ہے۔

یہ بحث میرا موضوع نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عورتوں اور لڑکیوں کو بانو جی سے ملنا چاہیے۔ [illegible] اندر ایک مکمل عورت کی روح سرایت کر جائے۔ وہ اشفاق احمد کو بہت بڑا سمجھتی ہیں۔ اپنا مرشد کہتی ہیں:

"بانو کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک پٹھان مرد کو ایک بہت بڑا انسان بنانے پر اپنا آپ نچھاور کر دیا۔ [illegible] بڑا انسان تو اشفاق احمد کے اندر تھا۔ دنیا میں بہت لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر ہوتا ہے بڑا آدمی۔ [illegible] باہر کا رستہ مشکل سے ملتا ہے۔ دروازہ ملتا ہے تو کھلتا نہیں۔ عورت دیواروں میں بھی دروازہ کرنا جانتی ہے۔

میرے نانا مظفر خاں بڑے سخت گیر پٹھان تھے۔ انہوں نے بھی ایک اعوان لڑکی سے محبت کی۔ [illegible] کر کے لے آئے اور شادی کر لی۔ محبوبہ تو مغویہ ہوتی ہی ہے۔ کسی کو اغوا کیا نہیں جا سکتا۔ یہ ڈاکہ ہوتا ہے۔ عورت [illegible] ہے۔ اسی لمحے میں جب محبت کی کرن اس کا لباس بن جاتی ہے۔ یہ مخلوق منکوحہ ہو جائے تو اس کی حقیقت بالکل [illegible] ہے۔ بابا مظفر خاں نے بظاہر کوئی حسن سلوک نہ کیا نانی اماں سے مگر کبھی نانی کے لبوں پر حرفِ شکایت نہ چمکا۔ [illegible] اس وقت کھلی جب وہ مر گئیں۔ نانا کی شخصیت کا جلال ایک ملال میں بھیگ گیا۔

ایک دن وہ دیوار کے سائے میں اداس کھڑے تھے۔ میں نے ان سے حال احوال پوچھا تو انہوں نے [illegible]

"بیٹا! میں یتیم ہو گیا ہوں۔"

زوجہ، زوجہ محترمہ بلکہ زوجہ والدہ ماجدہ کے رتبے پر جا پہنچی۔

محمد حسن عسکری نے کہیں ایک تمثیل بیان کی ہے کہ مرد بھول بھلیوں میں رازوں کے سراغ میں داخل [illegible] عورت ہاتھ میں اون کا ایک گولا لے کر ایک سرا اسے پکڑا دیتی ہے۔ کہیں سے کہاں تک گھومنے بھٹکنے کے بعد [illegible]

...۔ اسے پیچھے کا رستہ نہیں بھولتا۔ اُون کے دھاگے کی رہبری میں واپس آ جاتا ہے۔ اپنی عورت کے پاس جو اون کا گولہ ...یے اس کی منتظر ہوتی ہے۔ کارہائے نمایاں مرد کے ہیں۔ عورت بظاہر بے عملی کی تصویر ہے۔ عورت کا یہ عمل بے کار نہ ہوتو ...ہوں کی واپسی مشکوک ہو جاتی ہے۔ اسے بھٹکنے نہ دینے کا رستہ ہے وہ۔

اشفاق احمد کی بھیدوں کی خاطر زندگی کی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر تھک ہار کر اپنا سفر کھو بیٹھتا مگر بانو ان کے لیے ...جعت کی نشانی ہر وقت فراہم رکھتی ہے۔ وہ کہیں چلے جائیں انہیں خبر ہوتی ہے کہ آغاز میں بانو ہوگی۔ اس امید نے ...انجام سے بچائے رکھا ہے۔

ایسی کئی تمثیلیں دھرتی کے دل میں دھڑک رہی ہیں۔ عورت اور دھرتی ایک حقیقت کے دو روپ ہیں۔ دھرتی ...پنے سینے پر چلنے والوں کو صرف تحمل کا تختہ ہی نہیں دیتی، طاقت کا توازن بھی دیتی ہے۔

دھرتی کا سینہ تخلیق کا منبع ہے۔ دھرتی کسی سے روٹھتی نہیں۔ کسی کو روٹھنے دیتی بھی نہیں۔ ہم اسی کی کوکھ سے نکلتے ...اور پھر اسی کی کوکھ میں کہیں اور نکل جاتے ہیں۔ وہ اپنوں کو سفر پر جانے دیتی ہے اور مراجعت کی طلب ان کے دل میں ...رکھتی ہے۔

جوگی اتر پہاڑوں آیا، نی چرخے دی گھوک سُن کے

مجھے لگتا ہے کہ چاند پر بھی بانو جی ہی بیٹھی چرخہ کاتتی ہیں اور اشفاق احمد سورج کو تسخیر کرنے نکلے ہوئے ہیں۔ ...ج کو تسخیر کرنے کا مطلب اسے چاند بنانا ہو۔ بانو منتظر رہتی ہیں۔ دھاگے کا گولہ ہاتھ میں ہے اور چرخے کی گھوکر۔

چرخے کی گھوکر آج بھی ان کے دل میں گونجتی ہے۔

قاضی جاوید

قاضی جاوید نے مجھے اصل میں اکادمی ادبیات اور افتخار عارف سے متعارف کرایا۔ وہ اکادمی ادبیات کی لاہور ...مجھ کا ڈائریکٹر ہے۔ ادیبوں سے اس رسالے کے لیے ان کی نگارشات مانگنا، ان کے بائیوڈیٹا، ایڈریس اور فون نمبر جمع ...ے اور وقت بے وقت خیر سگالی کی ملاقاتیں اس کے ذمے ہیں۔ ٹیلی فون پر تو اس سے رابطہ تھا ہی لیکن اچانک اس سے ...ت بھی باقاعدگی سے ہونے لگی۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جب اثیر بیٹے نے میرا چارج سنبھال لیا تو اس کی ڈیوٹی بڑھ گئی۔ اس نے ...سے کچھ اظہار نہ کیا اور چپ چاپ اپنا بستر میرے پلنگ کے ساتھ جوڑ کر رات کو میری نگرانی کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے ...دیا کہ میری بیماریوں کے پیش نظر میرے لیے سیر بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے شام کو سیر کرانا ممکن نہ تھا کیونکہ وہ ...سے شام گئے، گھر آیا کرتا تھا۔

اس لیے ہم دونوں صبح سات بجے جوگر پہن کر چاک وچوبند نواز شریف پارک جاتے۔ یہ جوگر میرے لیے اثیر ...نے پہلی مرتبہ مجھے خود پہنائے کیونکہ مجھے تسمے باندھنا نہیں آتا تھا۔ پہلی مرتبہ جوگر پہن کر سیر کا تجربہ بالکل نیا تھا اور ایک

طرح سے یہ معیارِ زندگی بہتر کرنے کی تمہید بھی تھی۔

پارک کے اندر جانے کے صرف دس روپے فی کس لگتے تھے۔ اندر سیر کرنے کے دو راستے تھے۔ ایک تو پارک کے اندر کا راستہ تھا جس پر عام سیر کرنے والے خراماں خراماں جاتے اور دوسرا جوگنگ کرنے والوں کے لیے پارک کے میں گولائی میں چلتا۔ پورے ڈھائی کلومیٹر کی مسافت تھی۔ شروع میں تو اثیر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے عام اندر والے راستے پر ٹھہر کر سیر کراتے رہے۔ پھر جب میں رواں ہوگئی تو انہوں نے جوگنگ شروع کر دی۔۔۔ جوگنگ ٹریک پر نکل جاتے اندر والے راستے پر رواں ہو جاتی۔

آخر میں باہر والے احاطے میں ایک بنچ پر جو بھی پہلے پہنچتا، بیٹھ کر دوسرے کا انتظار کرتا۔

اسی سیر کے دوران مجھے ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر، نئے لکھنے والے ادیب اور ایکٹر بھی ملا کرتے۔ یہیں میری ملاقات قاضی جاوید اور مستنصر حسین تارڑ سے ہوئی۔ ایک درمیانے قد اور درمیانے جسم کا شخص دور کرسیوں پر بیٹھا تھا۔ وہ بھاگ کر سیر والی سڑک پر آ گیا۔ ہم نے خوشدلی سے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ پھر وہ کرسیوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے اثیر سے پوچھا۔

”بھائی یہ کون تھا؟“

”پتہ نہیں امی کوئی ابو کا جاننے والا ہی ہوگا۔“

کچھ ملاقاتوں میں باتوں ہی باتوں میں پتہ چلا کہ محترم قاضی جاوید ہیں۔ اس کے بعد یہ رابطہ مستقل ہو گیا۔ ایک روز ہم سیر کر کے باہر لوٹ رہے تھے تو ہم نے دیکھا جاوید پیدل جا رہے ہیں۔ اثیر بھاگ کر پاس پہنچا۔

”آپ کس طرح جائیں گے؟“

”بس لے لوں گا۔“

”لیکن آپ ہمارے ساتھ چلیے ناں۔ ابو کی گاڑی ہے۔“

پھر ہم انہیں گھر پہنچانے گئے۔ جب ہم انہیں گھر اتار کر واپس آئے تو اثیر بولے۔

”امی! یہ بہت دیانتدار شخص ہے۔ اس دور میں جب فنانس پر گاڑیاں مل رہی ہیں، سیکنڈ ہینڈ کاروں سے پڑا ہے۔ یہ اپنی سفید پوشی نبھائے چلے جا رہے ہیں۔“

پھر سیر چھوٹ گئی۔ مجھ میں سیر کی ہمت نہ رہی۔

لیکن قاضی جاوید سے رابطہ قائم رہا۔ اس سے ادیبوں کے فون نمبر ایڈریس تو ملتے ہی تھے لیکن اتحد۔۔۔ جاننے میں بھی وہ بہت معاون ثابت ہوئے۔

محمد طفیل + جاوید طفیل

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ”نقوش“ رسالہ نہ تواتر سے چھپتا تھا نہ اسے پڑھنے والا ایسی لگن سے پڑھتا

ایک سنجیدہ قاری کو بڑی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ دور غزل اور غزل کی معرفت نظم تک پہنچنے کا عہد تھا لیکن تب بھی طفیل جب ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ شیشوں والی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر خاں صاحب سے باتیں کرتے اور چلے جاتے۔ وہ ہر بار خاں صاحب کو اکساتے کہ 'داستان گو' ایک بار پھر شروع کیجیے۔ اب نئے رسالوں کی مانگ ہے۔

خاں صاحب کہتے ''تمہیں داستان گو پسند ہے؟''

''جی بہت۔''

''اس میں کیا بات اچھی لگتی ہے طفیل؟''

سوچ میں پڑ کر طفیل کہتے ''اس کا انوکھا پن، اس میں کئی ایسے مضمون ہوتے ہیں جو کسی اور رسالے میں نہیں ہے۔ مثلاً جانوروں کے متعلق۔''

''اچھا طفیل ایک کام کرو۔ تم اس رسالے کو چھاپ لو۔ میری پوری اجازت ہے۔ کہو گے تو تحریری اجازت نامہ لکھ دوں گا۔''

''ناں خاں جی ناں۔ میں ''نقوش'' کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ''داستان گو'' کیسے چلاؤں گا۔۔۔ یہ کام تو آپ ہی کو جچتا ہے۔''

خاں صاحب چلے گئے۔ طفیل رخصت ہو گئے لیکن جاوید طفیل نے اب بھی والد کی روایت جاری رکھی۔ وہ مجھے ملتے ہیں۔ عموماً ان کے ساتھ ''نقوش'' کا تحفہ ہوتا ہے۔ پھر میری خیر خیریت پوچھتے ہیں۔ کہانی کے لیے اصرار کرتے ہیں عقیدت سے رخصت چاہتے ہیں۔

ایسے ہی چاہنے والے قلم میں روشنائی بھر کر قلم و کاغذ نکالنے پر اکسایا کرتے ہیں۔

محمد طفیل کا انتقال 5 جولائی 1986ء کو ہوا۔

بپسی سدھوا

بپسی سدھوا میرے لیے شروع میں ایک نام تھا۔ ایک چھوٹا سا بادل جو افق پر کہیں معلق تھا۔ پھر ہولے ہولے یہ بھی بدلی میں منتقل ہوا۔ دیکھتے دیکھتے یہ گھٹا ٹوپ بادل بن گیا جو ابھی برسا کہ برسا اور پھر اس نے سارے لاہور پر تان لی۔ سورج کو بھی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ بپسی سدھوا بھی آئیوری مرچنٹ کی طرح اپنے کام سے پہچانی جاتی ہے کہ Beloved City کے سرورق پر کتاب کا نام چھوٹا رہ گیا اور بپسی سدھوا کا نام کتاب کی ضمانت بن گیا۔

لیکن شروع میں بپسی صرف ایک غیر معروف نام تھا جو کبھی کبھی خاں صاحب استعمال کیا کرتے۔ ایک دن وہ بک شاپ سے The Crow Eaters لے کر آئے اور کہنے لگے، یہ کتاب پڑھو۔ پارسی کمیونٹی پر اس سے بہتر کوئی ادب نظر سے نہیں گزرا۔ کتاب غلام علی اینڈ سنز کی چھپی ہوئی تھی، کاغذ معمولی تھا اور ابھی اس کا سرورق بھی غالباً نہ چھپا تھا۔ میں نے بڑی بدمعاملگی سے شروع کی لیکن جلد ہی میں نے اسے پوری توجہ، انہماک اور جی جان سے پڑھنا شروع

کر دیا۔ اسی طرح جب ''آتش رفتہ'' ''داستان گو'' میں چھپنے کے لیے آئی تھی، یہ کتاب مجھے حیران کر گئی تھی۔

یہ تب کا واقعہ ہے جب خاں صاحب اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر تھے۔ ہم سمن آباد سے نقل مکانی کر کے ماڈل ٹاؤن میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان دنوں اردو بورڈ کا دفتر گلبرگ میں مین مارکیٹ سے ملحق اور مین سڑک سے ... تھا۔ اس کی مالکہ بائی جی مسز بھنڈارا تھیں۔ خاں صاحب جلد ہی بائی جی کے چہیتے بن گئے اور ان ہی کی وساطت سے ... بپسی سدھوا کے نام سے متعارف ہوئے۔ پھر دو چار ملاقاتوں کے بعد خاں صاحب نے بپسی کو اس بات پر اکسانا ... کر دیا کہ کتاب کو مغرب میں کسی معروف ادارے سے چھپنا چاہیے جو اسے مغربی دنیا سے متعارف کرائے۔ جب ... صاحب بپسی کو اکساتے تو بائی جی عموماً ڈانٹ کے لہجے میں کہتیں ''او اشفاق بابا تو کاہے کو اس کو غلط راستے پر ڈالتا ہے ... چار کہانیاں میرے تیرے سے سن کر لکھ دی ہیں تو اس کو اتنا Importance نہ دے۔''

لیکن خاں صاحب اشتعال دلاتے رہے، ان کا خیال تھا کہ یہ کتاب ضرور تہلکہ ساز ہوگی۔ ...ed City جس پری زاد کے نام منسوب ہے، اس کی سالگرہ تھی۔ ان دنوں بائی جی مسز بھنڈارا حسین روڈ والی کوٹھی میں ... تھیں۔ ہم دونوں بپسی کی بیٹی پری زاد کی سالگرہ والے دن بروقت پہنچے۔ قیام پاکستان سے پہلے کی پرانی تعمیر شدہ کوٹھی ... سالگرہ کا سادہ سا اہتمام تھا۔ مہمان کم تھے اور کوئی طمطراق، کسی قسم کا Show off معیار زندگی کا رعب نہ تھا، حالانکہ ... جس سے ظاہر ہوتا کہ یہ لوگ اس قدر امیر ہیں کہ قیام پاکستان بننے کے بعد جب پہلی بار بجٹ میں خسارہ پڑا تو ... بھنڈارا نے وزیر خزانہ کو قرض دیا اور ایک طرح سے آئی ایم ایف کا کردار ادا کیا۔

چائے جاری تھی جب باہر کسی آئس کریم والے نے اونچی آواز میں آواز لگائی۔ پری زاد بائی جی کے پاس ... اور بولی ''مجھے دس روپے دے دو۔''

بپسی نے اشارے سے منع کیا لیکن پری زاد ٹلی نہیں۔ پھر دس روپے مانگے۔

بائی جی نے پیار سے پوچھا ''دس روپے کا ہے کو چاہیے؟''

''آئس کریم کھانی ہے۔''

خاں صاحب بائی جی کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے فوراً دس روپے کا نوٹ پری زاد کو دینا چاہا لیکن بائی جی نے ... روک دیا۔ پھر بائی جی نے کمال پیار سے پری زاد سے کہا ''تم کو کل آئس کریم ملے گا۔ جب ہمارا پری زاد سکول سے آئے گا ... آئس کریم فریج میں ہوگا۔'' یہ اس گھرانے کی تربیت تھی جو فضول خرچی نہیں سکھاتے تھے۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

مجھے سمجھ آ گئی کہ کیوں بپسی کی شخصیت، اس کی گفتگو، اس کے انداز تحریر میں نہ مبالغہ، نہ نمائشی پہلو ... زبان تھی، نہ زیبائشی انداز...... بہت برسوں بعد Crow Eaters, Ice Candyman Cometh, ...de' ... تینوں کتابیں باہر چھپ چکی تھیں۔ بپسی امریکہ میں Creative Writing بطور مضمون کے پڑھا رہی تھی۔ ... ایک بار جب بپسی لاہور آئی اور خاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو اسے دکھ تھا کہ فارن میڈیا ابھی بھی پاکستان کو ... نہیں دیتا جو اسے دینا چاہیے۔ خاں صاحب اور بپسی دونوں اپنے محبوب موضوع پر دیر تک باتیں کرتے رہے ... پاکستان تھا۔ دونوں جی جان سے اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اب ''محبوب شہر'' (Beloved City ...

کے پچپسی نے پاکستان سے اپنی محبت کا ایک بیّن ثبوت پیش کر دیا ہے۔

لاہور داتا کی نگری ہے۔ یہ ایک خوبصورت نہر سے آراستہ ہے۔ مغلیہ عمارتوں سے سجا ہوا، تعلیمی اداروں کی بستی ہے۔ میلے ٹھیلوں کی آوازوں سے گونجتا رہتا ہے۔ باغوں اور بہاروں والا ہے۔ کلچرل سٹی ہے۔ ادیبوں، شاعروں، موسیقاروں، فنکاروں کی بستی ہے۔ کھانے پینے کے رسیا لوگوں نے اس کی فوڈ سٹریٹس جاندار کر رکھی ہیں۔ پتنگ بازوں نے اس کے آسمان رنگین کر رکھے ہیں۔

یہی لاہور یونس ادیب کی قلم سے ہو گزرا ہے۔ ''تحقیقات چشتی'' کا حصہ بن گیا ہے، لیکن یہ بات مجھے اچنبھے میں ڈالتی ہے کہ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی پچپسی اسے بھولی نہیں جبکہ اس کے کئی شہریوں کو اس کی شناخت بھی یاد نہیں۔ یہی اس کا محبوب شہر بھی ہے اور اس کی کتاب دیکھ کر لگتا ہے جیسے کہہ رہی ہو جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ وطن کی یادیں زندہ رکھنے والی پچپسی سدھوا سلامت رہو، خوش رہو۔ لاہور کے عاشقوں کی طرف سے ہے...... سلام اور دعائیں۔

مینو بھنڈارا

بائی جی نے ہمیں دو بڑے خوبصورت تعلق عطا کیے، پچپسی سدھوا اور مینو بھنڈارا۔ مینو، خاں صاحب کو کبھی کبھی ملنے آتے تھے لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔

جب میرے بیٹے اثیر احمد خاں نے ''بونا میرا ایڈورٹائزنگ کمپنی'' بند کر دی تو بیکاری، نکھٹو پن کا بھوت سر پر چڑھنے لگا۔ اللہ سب بے عزتی اور ذلت سے کسی کو آشنا نہ کرے۔ قرض، بیکاری، گھریلو ناچاقی عموماً ایسی ذلت کا ضامن بن جاتی ہیں۔ انسان کی عزت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ دوسرے مشوروں کی آڑ میں احسان جتاتے ہوئے اور آپ کے نقائص محبت سے بیان کرتے کرتے ذلت کا گھونسہ مار جاتے ہیں۔ اثیر پر بھی کچھ ایسا ہی وقت تھا۔

پچھلے عہد حکومت میں چند اس وقت منسٹر تھے۔ میں ان سے پہلے چند اور صاحب ثروت وحیثیت لوگوں کو نوکری کے لیے کہہ چکی تھی لیکن بے سود۔ پھر میں نے مینو بھنڈارا سے کہا تو انہوں نے بڑی جلدی اثیر کو Islamic Bank میں نوکری دلوادی۔

جب بائی جی حیات تھیں، تب کی بات ہے جونہی انہیں پتہ چلتا کہ کوئی پارسی گھرانہ مالی مشکلات میں مبتلا ہے وہ ایک سیل تیار کرتیں۔ سب گھروں میں اطلاع دی جاتی کہ وہ اپنے پرانے کپڑے، جوتے جو سامان استعمال میں نہیں، بائی جی کے گھر عنایت کر دیں۔ اب اس بیکار سامان کو ڈبوں میں پیک کیا جاتا۔ بائی جی بڑے خوبصورت ڈبے اپنے ہاتھ سے تیار کرتیں۔ ان پر گفٹ پیپر چڑھاتیں۔ پھر ان میں سامان کو قرینے سے لگاتیں۔ سیل ہوتی۔ سامان ہاتھوں ہاتھ بک جاتا اور جو رقم جمع ہوتی وہ اسی ضرورت مند خاندان کو رات کے اندھیرے میں پہنچا دی جاتی۔

مینو بھنڈارا سے مل کر مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ خوبی ان میں اور بائی جی میں سانجھی تھی۔ عموماً ہر اقلیت

کے پاس بھی اخلاق کی برتری اسے اکثریت کے مقابلے میں سربلند کرتی ہے۔ کسی اور خوبی اور وصف سے اکثریت لوہا
مانتی۔ اللہ مینو بھنڈارا کو سلامت رکھے اور رفاہی کاموں کی اور توفیق دے۔ آمین

افضل توصیف

"کڑوا سچ" کالم لکھنے والی افضل توصیف ایک ایسی ڈرپوک روح ہے جو سچ بول کر کبوتر کی طرح آنکھیں
لیتی ہے اور دل میں سوچتی رہتی ہے کہ کہیں اس سچ کی مجھے اور میرے گھر والوں کو بھاری قیمت ادا نہ کرنا پڑے۔"
ادب" کے حوالے سے اس نے بڑا نام کمایا ہے۔ اسے ملکی اندوہناک حالات، سیاست کی اونچ نیچ، معاشرتی خرابیوں
تیکھا علم ہے۔ وہ ان سب کے لیے کچھ عمل بھی کرنا چاہتی ہے اور جب عمل کے میدان میں اترنے کے لیے اپنے وسائل
پاتی ہے تو قلم اٹھا کر کم از کم احتجاج اور جہاد شروع کر دیتی ہے۔

ایک لمبا عرصہ وہ میرے پاس آتی رہی۔ اس کے اپنے گھریلو حالات بھی ناساز گار تھے۔ اس لیے وہ
صاحب کے چلے جانے کے بعد میری مجبوریوں کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔ لکھنے لکھانے سے ہم دونوں وابستہ تھیں
تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہم دونوں نے کبھی حسد کی لپیٹ محسوس نہیں کی اور سچ اور کھلے دل سے ایک دوسرے کے فن کی داد
افضل توصیف زیادہ ترقی کی خواہاں بھی نہیں۔ جب سرکاری دوروں پر ادیب بھی نمک برابر ساتھ جاتے
افضل نے کبھی کسی سے سفارش کی نہ اس خواہش ہی کا اظہار کیا کہ وہ بھی اور کچھ نہیں تو دوسرے ممالک کی سیر کرنا چاہتی
اس دور میں ایسے ملکی حالات میں اتنا سیدھا راستہ پکڑنا اور استقامت سے اس پر چلتے رہنا بڑی ہمت
ہے۔

آفرین افضل توصیف آفرین۔۔

مستنصر حسین تارڑ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب ہم سے رخصت ہو چکے تھے۔ انیس اپنا گھر رائیونڈ میں
تھا۔ انیق امریکہ میں تھا۔ اثیر اظہار کے معاملے میں باپ کی مانند ہے۔ زبانی کلامی تشفی نہیں دے سکتا لیکن
محسوس کیا کہ مجھے گھر سے نکلنے کی ضرورت ہے۔

وہ بینک جانے سے پہلے مجھے نواز شریف پارک میں لے جاتا۔ کار کا کرایہ ادا کر کے انٹری فیس
دونوں باغ کے وسط میں ہوتے ہوئے دائرے کی شکل میں چلتے رہتے۔ اسی سیر کے دوران ایک دن میں نے
شخص بھاگم بھاگ ہماری طرف آیا۔

"میں مستنصر حسین تارڑ ہوں آپا۔" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"جی میں جانتی ہوں۔"

وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلنے گا۔

قریباً سال بھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب میرے بچے، پروڈیوسرز، تفریحی ملنے والوں کی تعداد بڑھ گئی تو اشیر کے ... ے ساتھ چلنا مشکل ہو گیا۔ اب وہ باہر کے جوگنگ ٹریک پر اکیلا نکل جاتا اور مجھے اپنا پینڈا اکیلا کرنے دیتا۔

ہم میں سے جو بھی پہلے آ جاتا، وہ باہر والی بنچ پر آ کر انتظار کرتا۔

مستنصر ان یادوں میں سرفہرست ہے۔ میں اس سے پہلے اس کے سفرنامے اور "بہاؤ" جیسے خوبصورت ناول ... شنا تھی۔ یہ ناول مجھے حیران کر گیا۔ ایک نئی زبان، کلچر اور بستی ہوئی آبادی کی خوابناک داستان کسی اور ادیب کے ... بات نہیں۔ پاکستان میں کسی ایسے ناول سے شناسا نہیں تھی جو تخیل کے زور پر اس پرانی تہذیب میں روح پھونک ... وہ زبان بھی اختراع کرے جو غالباً اس عہد میں بولی جاتی تھی۔

مستنصر خیال کے پیچھے بھاگنے والا ادیب ہے۔ وہ خیال کے بگولے کے پیچھے بھاگتا بھاگتا ایسے راستوں پر ... سے ہو گزرتا ہے جن کے متعلق ہم اپنے تصور میں بھی رنگ نہیں بھر سکتے۔ سفرنامے اس کی بے چین روح کی پیداوار ... ن میں وہ شیخیاں نہیں مارتا، گدگدی نہیں کرتا، کسی حسینہ کا سہارا نہیں لیتا۔ اسے "ماچومین" بننے کا کوئی شوق نہیں۔ پھر بھی ... والا اس کی کتاب چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ اس کا سفر سحر سے کم نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مستنصر خیال سے حقیقت کی طرف ... تا ہے۔ اس کی ترغیب خواب سے شروع ہوتی ہے اور پھر پہاڑوں میں ریگستانوں میں پہنچا دیتا ہے جو مکمل حقیقت ... راستے، راستے میں ملنے والے مناظر ہر چیز چھوئی، دیکھی اور احساسات کے ساتھ محسوس کی جا سکتی ہے۔

مستنصر کا نام ہی بڑا نامشکل نہیں، اس کے سفرنامے اور ناول، اس کے نام کی طرح ناقابلِ تقلید ہیں۔

سیر بالکل بند ہو گئی۔

لیکن یہاں کی ملاقاتیں گھر میں منتقل ہو گئیں۔ مستنصر اپنی بیگم کے ساتھ کبھی کبھی اور عموماً اکیلے ہی مجھے ملنے ... رہے اور یوں اس گلدستے میں اضافہ ہوا جو داستان سرائے کے کمرہ نمبر زاویہ میں سجا رہتا ہے۔

باقی آپ ٹیلی ویژن پر ان سے کافی واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ایک انوکھا پروگرام کرتے ہیں جو شادی ... ن قسم کا ہے، جس میں شادی کے آرزومند مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیوں کو باہمی رابطے کی صورت دکھاتے ... اس ثواب کے کام میں وہ میرج بیورو کا کام کرتے ہیں لیکن تعجب یہ ہے کہ چارج کچھ نہیں کرتے۔ یہ پھر مستنصر خیال کی مہربانی ہے۔ اس کا یقین ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے اور اس طرح پیسہ وصول کر کے انسان بڑے اجر سے محروم ہو جاتا ہے۔

کشور ناہید

کشور ناہید کو اپنی زندگی کے سفر کو سیدھا کرنے میں بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ اسی مشقت بھری زندگی میں کسی

مقام پر وہ بہادر عورت بن گئی۔ اب اس کا ذاتی غم، ناکامی اور "واحسرتا" قسم کی مایوسی نے عمومی رنگ بنالیا۔ وہ اپنے نجی لبادہ اتار کر کالا لباس پہن کر عورت کی مظلومیت کی داعی بن گئی۔ اس کا خیال، اس کی تحریکوں میں ابھرنے لگا۔ وہ ایک بے کو بھی یہ سننے کو تیار نہ تھی کہ "کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"۔ وہ یہ ماننے کو راضی نہیں کہ مرد کی زندگی جو عورت اور بچوں کفالت کا بوجھ اٹھاتی ہے، اسے بیرون گھر کچھ ذلتوں کا سامنا رہتا ہوگا۔ افسروں کی زیادتی، ماتحتوں کے موڈ، کام کی اڑچن، مرد کی عزتِ نفس پر پے در پے حملے کرتی ہیں۔

اب کشور عورتوں کو اس بات پر اکساتی ہے۔ اٹھو اور میری دنیا کی عورتوں کو جگا دو۔ وہ بھی باہر نکلیں اور اپنے حصے کا رزق کمائیں۔ گھر کی پرورش، بچوں کی رہنمائی، شوہر کی دلجوئی کو خدا حافظ کہیں۔ بیسویں صدی عورت کی آزادی کی علمبردار ہے۔ اب شادی وہی تھپیڑے کھائے گی جو مغرب کے معاشرے میں اس کا نصیب ہے۔ شادی کا مستقبل، مشرق میں بھی مشکوک ہو چکا ہے۔ اب یہاں بھی خاندانی نظام مشکوک ہے اور بچے جو ہر نسل کا مستقبل ہیں، ماں باپ کی طرف دیکھتے رہ گئے ہیں اور پوچھتے ہیں آخر وہ کس کی اولاد ہیں۔ انہیں اتنا لاوارث کیوں چھوڑ دیا گیا؟

لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب کشور لمبی اڑانوں پر نہیں نکلی تھی۔ وہ خان صاحب کی چہیتی تھی اور " پروگرام کے ہر Episode میں ان کے ساتھ بیٹھتی تھی۔ اس کے چہرے پر قدرتی حیا اور بیٹی کا سا ادب چھایا ہوتا لیکن یوسف کامران اللہ کو پیارا ہو گیا۔ چادر اور چار دیواری کا تصور ختم ہو گیا۔ اب کشور عورت سے انسان بن گئی۔ اس کے گھر شام کو رنگ رلیوں کی محفل ہوتی اور کشور آزادی پسند لوگوں کی میزبانی کرتی۔

کشور دل کی اچھی لیکن زبان کی آری چلانے سے باز نہیں آتی۔ دعا ہے کہ اسے اپنے رویے میں "توازن" کی خوبی مل جائے۔ وہ اپنے بچوں، ملاقاتیوں اور رشتہ داروں کے لیے مثبت رویہ، سوچ اور عمل رکھے۔ اس سے خود ذات کو بہت سکون اور اطمینان ملے گا اور وہ اللہ کے شکر گزاروں میں شامل ہو جائے گی۔ یہ نسخہ بھی آزما دیکھیں کشور..... ایک مطمئن ماں سے بڑی وراثت اولاد کے لیے کچھ نہیں......

افتخار عارف

افتخار عارف اپنی عینک کو اس طور استعمال کرتے ہیں، جیسے چنچل لڑکیاں اپنے دوپٹے کو اداؤں ہیں۔ افتخار عینک چہرے سے کم کم اتارتے ہیں لیکن اپنی انگشتِ شہادت سے کبھی انگوٹھے سے اسے ناک پر جماتے ہیں۔ ہجرت کر کے جو لوگ بھی پاکستان میں آئے ہیں، ان کی مشکلات مقامی لوگوں کی سمجھ میں پورے طور پر نہیں زبان، رسم و رواج، رہن سہن میں تو واضح طور پر فرق ہوتے ہی ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ Acceptance کا ہے مہاجر بہت زیادہ خوشدلی سے آگے بڑھ بڑھ کر آپ سے دوستی کرنا چاہے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔ اس پر مفاد کا لیبل لگ جاتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں توازن قائم رکھنا اور اصلی میرٹ کی وساطت سے مقام پیدا کرنا کارِ دارد ہے۔

لیے اردو ادب میں مقام پیدا کرنا خاصی کٹھن منزل ہوتی اگر اس کے پاس شاعری کا ہتھیار نہ ہوتا۔ اس کی شاعری میں وہ ساختگی، تیکھا پن اور دل میں اتر جانے والی خاصیت ہے جو اس کی آدھی لڑائی لڑتی ہے۔ جو لوگ بظاہر افتخار کے قائل نظر نہیں بھی آتے، وہ بھی اس کے اشعار کی تاثیر سے انکار نہیں کرسکتے۔

میں افتخار سے خاں صاحب کے جانے کے بعد ملی۔ خراجِ تحسین کا پروگرام تھا۔ وہ میرے سامنے والی قطار میں بیٹھا تھا۔ دو تین بار اٹھ کر آیا اور لفظی اظہار کے بغیر اظہارِ ہمدردی کر گیا۔ خاں صاحب سے اس طرح پیار کرنے والوں کی فہرست میں افتخار ایک قابلِ ذکر شخصیت ہے۔ اب باقاعدگی سے ''ادبیات'' ملتا ہے۔ افسانوں کے لیے اظہار اور عقیدت کو چھپا کر نہیں اعلانیہ پیش کر دیتا ہے۔

شکریہ اور پھر شکریہ......

امجد اسلام امجد + عطاء الحق قاسمی

امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی ایسے جڑواں ادیب ہیں جن کا تصور علیحدہ کرنا میرے لیے مشکل ہے۔

خاں صاحب کی ان دونوں سے محبت مجھے تھوڑا سا حسد عطا کیا کرتی تھی۔

امجد جب بھی کوئی نئی نظم یا غزل لکھتا فوراً داستان سرائے پہنچا کرتا۔ عطاء آتا تو اپنے کالم، نظمیں ساتھ ضرور لاتا۔ ایک روز جب عطاء گھر پہنچا تو دوپہر کے کھانے کا وقت تھا۔ خاں صاحب نے مجھے کھانا لانے کے لیے کہا۔ اس روز سرسوں کا ساگ پکا تھا اور میں مکئی کی روٹی بنا رہی تھی۔ تازہ مکھن اور روٹی لے کر میں اندر پہنچی تو عطا نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

''یہ روٹی آپ نے پکائی ہے بانو آپا؟''

''بالکل کوئی شک ہو تو اندر آ کر دیکھ لو۔''

اس نے حیران ہو کر سر دائیں بائیں ہلایا۔ ''پڑھی لکھی عورت اور اس قدر مہارت! تعجب، حیرانی!''

تعریف نشانے پر لگی۔ میرے دل میں عطاء نے گھر کر لیا۔ ان دنوں ''معاصر'' رسالے کے دونوں کرتا دھرتا امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی رسالے سے قریب قریب ریٹائر ہی ہو چکے تھے اور عطاء کا بیٹا عمر قاسمی ادارت کی ذمہ داری سنبھالتا تھا۔ شاید عطاء نے گھر پر میری تعریف کی ہو کیونکہ اسی واقعے کے بعد عمر نے ''راجہ گدھ'' پر ایک سیر حاصل مضمون لکھا اور مجھے اپنے احسان کے Lasso میں گھیر لیا۔

خاں صاحب بابوں کی طرح سمجھتے تھے کہ دستر خوان دوستی اور اظہارِ یگانگت کے لیے ایک آزمایا ہوا نسخہ ہے۔ ایک مرتبہ جب امجد اسلام امجد اپنی بیوی فردوس کے ہمراہ آئے تو فردوس کچھ پکوان پکا کر لائی لیکن انڈے ادرک کی ڈش نے میلہ لوٹ لیا۔

''بھئی ادرک انڈے قدسیہ کو پکانا سکھا دو فردوس۔''

فردوس نے بڑی لگن اور محنت سے مجھے ترکیب سمجھائی لیکن وہ لطف پیدا نہ ہو سکا جو فردوس کے پکیا رے میں تھا۔ غالباً یہی ہاتھ کا فرق ہے جو کسی ہوٹل کی مشہوری کا باعث بن جاتا ہے۔

امجد ہمیں ایک مرتبہ اصرار کے ساتھ چائنیز کھانا کھلانے لے گیا۔ جس محبت سے اس نے کھانے کا آرڈر دیا وہ کھانا بھلائے نہیں بھولتا۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد وہ باقاعدگی کے ساتھ میری خیریت معلوم کرنے آیا کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے لگتا ہے جیسے وہ میری ساری تنہائی کو کسی طرح اپنے اندر جذب کر کے لے جانا چاہتا ہے۔ جاتے وقت اس کے کندھے کچھ ایسے سکڑے ہوئے خمیدہ ہو جاتے ہیں جیسے وہ اپنے مشن میں فیل ہو گیا ہو۔

بیشتر ادیبوں کی طرح عطاء اور امجد نے روزی کمانے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے ہیں۔ ایم اے او کالج میں پڑھایا۔ گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کی۔ ان دنوں امجد اسلام امجد Children Complex کا ڈائریکٹر جنرل ہے۔ اتنی مصروف زندگی میں وہ پتہ نہیں میرے لیے کیسے وقت نکال لیتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی اپنی بیگم کو بھی دو تین بار میرے پاس لائے ہیں۔ خاموش خاموش، پروفیسرنی کم گو بھی ہیں اور عطاء میں گم بھی ہیں۔ اس جوڑی کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کے سہارے جینے کا فن سیکھ لیا ہے اور ان کو اب گھر سے باہر رابطوں کی ضرورت نہیں۔

''معاصر'' رسالے کے لیے امجد اور عطاء نے بڑی محنت کی۔ رسالہ مستقل مزاجی اور استقامت کے بغیر نکالنا مشکل ہے اور ان دونوں کی سانجھی کوشش سے یہ رسالہ اردو کے رسالوں میں ''سرکڈواں'' نظر آتا ہے۔

سیما پیروز، یاسمین حمید، رخشندہ نوید

یہ تینوں نہ تو دوست ہیں اور نہ غالباً ایک دوسرے کو جانتی ہی ہیں لیکن میرے ذہن کی سکرین پر یہ تینوں چہرے عموماً ڈزانو (Desolve) کر کے کبھی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور کبھی ایک کے بعد دوسرے ٹھپے کی طرح رنگوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔

سیما پیروز عموماً جب مجھ سے ملنے آتی تو قاضی پیروز بھی اس کے ساتھ ہوتے۔ قاضی بھی اچھی بھلی کہانیاں لکھتے تھے لیکن شاید سیما کے پیٹرو بکس کے آگے ان کا دیا نہ جل سکا یا پھر روزی کمانے اور گھریلو اخراجات پورے کرنے کی تگ و دو نے انہیں اس فیلڈ میں دور تک چلنے نہ دیا۔

آج مسابقت کے عہد میں ویسے بھی اچھے بھلے ادیب یونہی روندے جاتے ہیں اور کچھ بانصیب لوگوں کے کندھوں پر سوار بالا ہی بالا ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، جن کی اُن کو بھی امید نہیں ہوتی۔ سیما کے نصیب یاور تھے۔ کافی فاصلہ طے کر گئی۔ میرا خیال ہے جہاں تک اس کی رسائی ہو سکتی تھی، وہاں تک وہ پہنچ نہ پائی۔ پتہ نہیں پی آر کی کمی تھی یا محنت کی۔ بہرکیف ترقی کا سفر ایسا ہے کہ اس کے لیے حتمی طور پر کچھ بھی کہا نہیں جا سکتا۔

یاسمین میرے پاس آئی تو وہ مجھے نہ تو استانی لگی نہ شاعرہ۔ میرا خیال ہوا کہ وہ ٹی وی سے وابستہ ہے اور کسی

کے سلسلہ میں آئی ہے لیکن جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو بھید کھلا کہ موصوفہ ایک بڑی حساس شاعرہ ہیں اور ان کا پروفیشن تعلیم وتدریس سے ہے۔ یاسمین مجھے ملنے آتی رہیں لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد اسے زندگی کی مصروفیت نے ...پ کرلیا۔

رخشندہ نوید جب پہلی مرتبہ مجھے ملیں تو ان کے ہاتھ میں اپنی شاعری کا مسودہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں اس پر دیباچہ لکھ دوں۔

''تم غلطی پر ہو رخشندہ۔ تمہارا مطلب یہ ہوگا کہ خاں صاحب تمہارے لیے پیش لفظ رقم کریں۔''

''نہیں بانو آپا، آپ ہی لکھ کر دیجیے۔ وہ پتہ نہیں کتنی دیر لگا دیں گے۔''

مجھے اس کے چہرے پر ایسی حیا نظر آئی جس نے مجھے بڑا متاثر کیا اور میں نے مسودہ اس سے پکڑ لیا۔

ابھی خاں صاحب حیات تھے۔ ایک دن میں نے ٹیلی ویژن لگایا تو سکرین پر سرفراز شاہ صاحب نظر آئے۔ رخشندہ نوید ان کا انٹرویو لے رہی تھی۔ شاہ صاحب کچھ روحانی بصیرت کے حوالے سے لوگوں کے مسائل اور ان کے حل پیش کر رہے تھے۔ ابھی ٹیلی ویژن پر ایسے پروگرام کم ہوتے تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا غالباً پہلا پروگرام تھا جو زاویے کے شانہ بشانہ چلتا رہا۔ پھر شاہ جی لندن چلے گئے اور یہ پروگرام سکرین سے مع رخشندہ نوید غائب ہو گیا۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ موصوفہ کہاں ہوتی ہیں۔ ان کی نظمیں، غزلیں میں شوق سے رسالوں میں پڑھتی ہوں۔ کچھ پرانے تعلق کی بنا پر۔ کچھ اس کی شاعری میں اپنی ہی سلگاہٹ ہے جس کی تپش آسانی سے آپ تک پہنچ جاتی ہے۔

زندگی کا شکریہ جس نے مجھے ایسی محبت کرنے والی روحیں ملا دیں۔

احمد عقیل روبی

میرا خیال ہے کہ ہر پچیس تیس سال کے بعد ہر ملک کے مشاہیر بدل جاتے ہیں۔ جوں جوں نئی ایجادات فروغ پاتی ہیں۔ معاشرہ غیر محسوس طریقے سے نئے رسم و رواج، لباس کی تراش خراش، زبان میں نئے الفاظ کی نمو، معیارِ زندگی میں نئے انداز اختیار کر لیتا ہے۔ زبان جو ادیب کا ہتھیار ہے، اس میں بھی نئے الفاظ کی پنیری لگ جاتی ہے۔ انگریزی تو عصری زبان میں داخل ہو ہی رہی ہے لیکن اردو بھی اب انگریزی میں لکھے جانے پر مُصر ہے۔ اسے فیشن کہہ لیجیے کہ وقت کی ضرورت کہ زبان پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہے۔

اب آپ کو جگہ جگہ Bill Boards پر ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں ایسے اردو الفاظ کثرت سے نظر آئیں گے جو انگریزی میں اردو کو رواج دے رہے ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ادبی دنیا ایک گلوبل ویلج بننے پر مصر ہے۔ صرف ایک مشکل ہے کہ ابھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس جیسی قدر نہیں بدلی۔ معاشرے میں انصاف کی بنیادی اہمیت کا اسلامی معاشروں کو نہ احساس ہے نہ وہ اس معاملے میں کوئی ذمہ داری ہی محسوس کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ہم سب الفاظ کے استعمال میں فراخدل ہو رہے ہیں، لیکن عقیل روبی ایک نئی سمت سے اس تبدیلی

میں داخل ہوا ہے۔ عقیل روبی گریک Mythology میں سرتاپا کھویا ہوا ہے۔ اس نے ہندو دیو مالاؤں کی طرف کم توجہ دی ہے۔ وہ Odepius, Trojen Wars بادشاہ اور ہیلن آف ٹرائے کے شہرہ آفاق حسن کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ میں ترجموں کی بات نہیں کر سکی۔ ورلڈ کلاسیک کا ترجمہ ایک بہت خوش آئند عمل ہے لیکن عقیل روبی نے صرف ترجمے کا سہارا نہیں لیا۔ ہمارے ادب کو گریک دیو مالاؤں سے رنگ برنگی روایات دکھانے کی کوشش کی ہے۔

عقیل روبی ہمارے گھر میں ممتاز مفتی کی وجہ سے آتے تھے۔ مفتی جی جب بھی لاہور آتے، اپنا میلہ ساتھ لاتے۔ خاں صاحب سے بھی ان آنے والوں کی ملاقات ہو جاتی۔ پھر کچھ لوگ مفتی جی کو نہ چھوڑتے اور کچھ ان سے بچھڑ کر خاں صاحب کے ارادت مند بن جاتے اور مفتی جی کونے سے لگ جاتے لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک مفتی جی حیات رہے، عقیل ان ہی کے حلقۂ ارادات میں داخل رہے اور خاں صاحب کو بھی دوسرے درجے کی توجہ دی۔ اس بات کا اندازہ میں نے یوں لگایا کہ عقیل روبی نے مفتی جی پر ''علی پور کا مفتی'' تحریر کی لیکن انہیں کبھی خاں صاحب پر ایسی کوئی کتاب لکھنے کا خیال نہ آیا۔

ابدال بیلا اور عقیل روبی مفتی جی کے ایسے عاشق زار ہیں جنھوں نے اپنی محبت میں دوئی کا زہر نہیں ملایا۔ شاید اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں تنقید نگار نہیں ادیب ہیں اور وہ جب بھی لکھتے ہیں ان پر جذبات حاوی ہو جاتے ہیں اور وہ کسی چیز پر معروضی تبصرہ نہیں کر سکتے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد عقیل روبی نے بڑی مروت سے مجھے ملنا شروع کر دیا۔ خاں صاحب کو گویا سب چاہنے والوں کی محبت سے میری زندگی کا خلا پُر کر رہے تھے۔

ایک روز شام کے وقت عقیل روبی آیا۔ پتہ نہیں ہمارے ڈرائنگ روم کا مشرق کی جانب شیشے کی لمبی کھڑکی سے کیا تعلق ہے کہ عموماً یہاں ہی کچھ ایسے بھید کھل جاتے ہیں جو ہماری شعوری سوچ کا حصہ نہیں ہوتا اور یہ بات بھی سمجھ نہیں آتی کہ ایسے واقعے عموماً عصر اور مغرب کے درمیان کیوں ہوتے ہیں۔

جس روز شام کو عقیل آیا۔ کہیں مغرب کا وقت قریب تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور وقت کا تعین نہ ہو سکتا تھا۔

''آپا جی ..... باہر لان میں دیکھیے۔''

میں نے باہر نگاہ دوڑائی۔

''کیا آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ اس وقت چاند نکلنے والا ہے کہ سورج طلوع ہونے کا سمے ہے؟''

''لو اس کا اندازہ لگانا تو آسان ہے۔ ابھی میں نے عصر پڑھی ہے۔ اب تو غروب آفتاب کا وقت ہے۔ بادلوں کی وجہ سے سرخی نظر نہیں آ رہی۔''

''نہیں نہیں بانو آپا! آپ تو تجربے سے بات کر رہی ہیں۔ بھلا اگر کسی دوسرے ملک کے اجنبی کو آنکھوں پر پٹی باندھ کر ملکہ سبا کی طرح یہاں لے آیا جائے تو کیا وہ بتا سکے گا کہ سورج نکلنے والا ہے کہ ماہ منیر۔''

''ہاں پھر تو مشکل ہے۔''

''میں کافی دیر سے ارضی و سماوی نباتات و جمادات، بہتے پانی، اونچے پہاڑ دیکھ رہا ہوں۔ بادلوں نے مجھے

ش گم کر دیے ہیں۔ بانو آپا! جو راز مذہب کی جھولی میں چھپے ہیں ان کا مقابلہ تو کوئی دیو مالا نہیں کر سکتی، آخر فلسفی اور دیو مالائی ہیرو بھی تو زندگی کے معنی تلاش کرتے ہیں، لیکن جو معنی مذہب عیاں کرتا ہے اور ڈھانپ بھی رکھتا ہے اس سے بے اسرار، راز اور کہاں ہوں گے۔"

کچھ عرصے بعد مجھے پتہ چلا کہ عقیل روبی نے جو کچھ گریک Mythology سے حاصل کرنا تھا، غالباً کر لیا اور پگڈنڈیوں کا سفر چھوڑ کر بڑی شاہراہ پر گامزن ہو گئے۔ اس کی شہادت یوں ملی کہ ایک روز وہ آیا تو اس کے ساتھ "سورۃ حمد" کا منظوم ترجمہ تھا۔

اصرار سے بولا۔ "بانو آپا! اسے پڑھ کر ضرور بتایئے کہ ترجمہ کیسا ہوا؟"

میں اسے بتا نہ سکی کہ ترجمہ کیسا تھا۔ نہ مجھے مذہب کی سمجھ تھی نہ شاعری کی نہ ترجمے ہی کی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے کہ ایک روز عقیل ملنے آئے تو میں نے اپنے کچھ شکوک کا اظہار کیا۔

"عقیل ..... نماز کے کچھ حصے میری سمجھ میں نہیں آتے۔"

"آپ سمجھ کے کیا لیں گی۔ ساری نماز حمد و ثنا ہے اور انسان کی عاجزی اور اللہ سے مدد مانگنے کے لیے پڑھی جاتی ہے۔ یقین جانیے بانو آپا! اللہ کو ہماری تعریف سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ضرور ہے کہ میرے لیے نماز پڑھو لیکن وہ بے نیاز اس نماز کا محتاج نہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ ہم پانچ وقت اس کی مدد کے طالب رہیں اور ارض و سما کے ان لوگوں میں شامل رہیں جو اسی سے مانگتے ہیں۔ یہ نماز ہماری روح کو دھوبی کی طرح دھوتی ہے۔ اس کا فائدہ صرف ہمیں ہے۔"

میں عقیل روبی کی تبدیلیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہوں۔ ویسے تو ہر انساں تک رسائی مشکل ہے لیکن ایسا انسان جو صحیح طور پر راتی کروٹیں نے اس کا کیا پڑتا لگائیں۔

محمد یونس بٹ

آپ لوگ محمد یونس بٹ کو ایک مختلف زاویے سے دیکھتے ہیں۔ آج کے سٹ کام کے عہد میں جب آدمی کے چہرے سخت، آنکھیں تنی ہوئی اور زبان لکنت کے آس پاس رہتی ہے۔ یہ ساری ٹینشن، ہلکے پھلکے مزاح سے دور کرنے کی کوشش میں محمد یونس بٹ ہی کامیاب ہے۔ وہ جملے اٹھانے اور اس میں نئے معنی اور روح پھونکنے میں لاجواب ہے۔

لیکن میں محمد یونس بٹ کو اپنے محسن کے طور پر جانتی ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب 1985ء میں مجھے بلڈ کینسر نے گھیر لیا تھا۔ میں یونس کو نہیں جانتی تھی۔ وہ بھی خاں صاحب سے ملنے ڈرائنگ روم کی حد تک آیا کرتا تھا۔ غالباً وہ ہمیشہ سے ایک ہمدرد دل کا مالک ہے۔ جب میں ہسپتال میں داخل ہوئی تو پتہ چلا کہ مجھے خون کی شدید ضرورت ہے۔ سارا دن خون کی بوتل لگتی اور بلڈ کاؤنٹ کو بارہ تک لایا جاتا۔ پھر بیماری حملہ آور ہوتی اور میرا بلڈ کاؤنٹ گر کر چھ تک ہو جاتا۔

ہسپتال میں سب سے پہلا Donor اشتیاق کا بیٹا صائل پہنچا۔ اس نوجوان نے مجھ سے کہیں پہلے میرا بلڈ گروپ اپنے لہو سے میچ کرا کر بی پوزیٹو لہو کی بوتل جمع بھی کرا دی تھی۔